# چند قیمتی "لمحات"

پروفیسر عبدالقدیر سلیم ○

خود نوشت' اس اعتبار سے سوانحی ادب کی ایک اہم صنف ہے کہ اس کے ذریعے قارئین کو نہ صرف کسی شخصیت کے اندر جھانکنے کا موقع ملتا ہے' بلکہ ایک عہد کے حالات کا ایسا مرقع دیکھنے کو ملتا ہے جو عام تاریخ کی کتابیں پیش نہیں کرتیں۔ برعظیم کے سوانحی ادب میں اس قبیل کی بہت سی خود نوشت سوانح حیات نظر آتی ہیں' مثلاً ڈاکٹر یوسف حسین خاں کی یادوں کی دنیا' ظفرحسن ایبک کی آپ بیتی' سر علی رضا کی اعمال نامہ' احسان دانش کی جہان دانش' جوش ملیح آبادی کی یادوں کی بارات' سر ظفراللہ خاں کی تحدیث نعمت' قدرت اللہ شہاب کی شہاب نامہ' اور آل احمد سرور کی خواب باقی ہیں وغیرہ۔

مذکورہ کتابیں ایک لحاظ سے اپنی نوعیت کی نمایندہ مثالیں ہیں جن میں مصنفین اپنے مخصوص زاویے اور زندگی سے متعلق اپنے رویے کی عکاسی کرتے ہیں۔ اس عنوان سے دیکھیں تو خرم جاہ مراد (م ۱۹ دسمبر ۱۹۹۶ء) کی لمحات اپنی نوعیت کی ایک منفرد "خودگفت" سوانح ہے۔ ایک تفصیلی اشاریے سمیت ۵۶۰ صفحات پر مشتمل اس "یادداشت" کو جو انھوں نے اپنے برادر خورد پروفیسر مسلم سجاد اور رفیق کار پروفیسر سلیم منصور خالد کی فرمایش پر اپنی حیات مستعار کے آخری چند ماہ میں ٹیپ پر ثبت کر کے لندن سے بھجوایا تھا' ایک شخص نہیں' بلکہ ایک تحریک اور ایک جماعت' جماعت اسلامی کے "ایک" خوردبینی مطالعے کی حیثیت سے دیکھا جا سکتا ہے۔ یہ پاکستان میں اسلام پسند طلبہ کی تحریک کے ایک کارکن اور پھر اس کے محبوب قائد کی یادوں کا ایک دل چسپ مرقع ہی نہیں' بلکہ جماعت اسلامی کے ایک صف اول کے رہنما کے سیاسی مشاہدات اور منفرد تجزیوں کا ایک ایسا خزینہ بھی ہے جو پاکستان کی تاریخ کا مطالعہ کرنے والوں کے لیے ایک بیش بہا دستاویز اور ماخذ (resource) ثابت ہو گا۔

لمحات میں خرم کی پوری شعوری زندگی ایک بامقصد سفر نظر آتی ہے: مقصدیت' مقصدیت' مقصدیت۔

---

○ وزٹنگ پروفیسر' انسٹی ٹیوٹ آف بزنس ایڈمنسٹریشن' کراچی

بعض اوقات تو قاری مسکرا کر (یا جھلا کر) پوچھ بیٹھتا ہے کہ آیا آپ کی زندگی کبھی بچپن، لڑکپن اور نوجوانی کے مراحل سے بھی گزری ہے؟ یا:

آں بہ پیری کودک و ایں پیر درعہد شباب!

کا معاملہ ہے۔ اگر جواب اثبات میں ہے، تو ان مراحل کے نشان اور سنگ ہائے میل بھی تھے یا نہیں؟ آپ نے کبھی متانت و سنجیدگی کا جامہ چاک کر کے نعرۂ مستانہ بھی لگایا؟ دانائی کی حدوں کو پھلانگ کر کبھی حماقتوں کی لذات سے بھی آشنا ہوئے؟

یہ پوری کتاب خرم کی زندگی کے ایک خط مستقیم کی داستان ہے۔ اس میں نشیب و فراز تو ہیں مگر سمت سفر سے انحراف کہیں نہیں۔ اِهْدِنَا الصِّرَاطَ الْمُسْتَقِيمَ ○ صِرَاطَ الَّذِينَ اَنْعَمْتَ عَلَيْهِمْ (الفاتحہ ۱: ۳-۴)۔ وہ ایسے لوگوں میں سے تھے، جن پر اللہ تعالیٰ کے انعامات واضح، نمایاں اور فراواں نظر آتے ہیں، اور اس طرح یہ کتاب "تحدیث نعمت" کہی جانے کی واقعتاً مستحق ہے۔ انھیں حکمت و ایقان کا جو بیش بہا خزینہ ملا تھا، انھوں نے اسے بڑی فراخ دلی سے اپنی تحریر و تقریر کے ذریعے پھیلایا اور تقسیم کیا۔ پیش نظر کتاب غالباً اس سلسلے کی آخری کڑی ہے، جو ان کی طرف سے آئی ہے۔

خرم کے والد کا تعلق سرگودھا سے تھا، لیکن خرم کی ابتدائی زندگی اور تعلیم و تربیت بھوپال (ہند) کی مسلم ریاست میں ہوئی۔ والدہ اور بڑی بہنیں جماعت اسلامی کے ابتدائی دور (پٹھان کوٹ) ہی میں اس تحریک سے وابستہ ہو گئی تھیں۔ لیکن ان کے والد (دینی رجحان کے باوجود) اسے پسند نہ کرتے تھے۔ بہرحال کشیدگی کے اس گھریلو ماحول میں خرم کا بچپن گزرا جس میں والد صاحب جماعت اسلامی کے مخالف اور والدہ اور بڑی بہنیں، زبردست حامی تھیں۔ اسی زمانے میں ۸، ۹ سال کی عمر میں ہم خرم کو "اپنی افسردہ آپا" سے یہ کہتا ہوا پاتے ہیں: "میں جب بڑا ہو جاؤں گا تو جماعت اسلامی کا کام کروں گا" (ص ۳۹)۔

خرم کہتے ہیں کہ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ "جو وابستگی جذبات کی بنیاد پر استوار ہو جائے، وہ غالباً آزمائش میں بھی بڑی پائے دار ثابت ہوتی ہے۔ اس کے مقابلے میں جو وابستگی عقلی ہوتی ہے وہ غالباً کمزور ثابت ہوتی ہے"۔ اپنی والدہ اور بہنوں سے اسی وابستگی کے بارے میں ان کا گمان ہے کہ تحریک کے ساتھ ان کے کمٹ منٹ کا باعث یہی بنی۔ بہرحال یہ بات مولانا سید ابوالاعلیٰ مودودیؒ کے دعوتی نقطۂ نظر اور حکمت عملی سے متغائر محسوس ہوتی ہے کہ ان کی ساری دعوت میں زور غور و فکر، تدبر و تعقل ہی پر نظر آتا ہے کہ ان کے نزدیک کسی تحریک سے مستحکم وابستگی کی بنیادیں یہی ہو سکتی ہیں۔

اس طرح عوامی لیگ کے ایک بااثر خاندان سے ان کے گہرے روابط ہو گئے، اور سوا دو سال بعد جب پاکستانی فوج کے ہتھیار ڈال دینے کے بعد ہر غیر بنگالی اور "بنگلہ دیش" کے مخالف کا خون مشرقی پاکستان میں

مباح ہو چکا تھا، انھیں اسی گھرانے میں پناہ ملی۔ یوں وہ قرآنی حکم "برائی اور بھلائی برابر نہیں ہوتے" کی عملی تفسیر کے ذریعے ایک واضح پیغام دیتے نظر آتے ہیں۔

بھوپال سے کراچی آنے کے بعد ان کا خاندان اپنے ماموں زاہد حسین کے ہاں مقیم ہوا (جو اسٹیٹ بنک آف پاکستان کے پہلے گورنر بنے)۔ اس وقت "حکومت اور جماعت [ اسلامی ] کے درمیان "قرارداد مقاصد" کے مسئلے پر کش مکش چل رہی تھی.... اس میں میرے جذبات، تمنائیں، آرزوئیں اور ہمدردیاں جماعت اسلامی اور پاکستان کو اسلامی ریاست بنانے کی کوششوں کے ساتھ تھیں" (ص ۶۶)۔ مگر حکومت اور مقتدر اشخاص اس طرح کی کوششوں کے سخت مخالفت تھے۔ یہی فضا ان کے ماموں کے گھر کی بھی تھی (ممانی، آل پاکستان ویمنز ایسوسی ایشن کی فعال کارکن تھیں)۔ یہیں گھر میں یہ تک بھی سنا کہ "مولانا مودودی کو پھانسی پر چڑھا دینا چاہیے" (ص ۶۷)۔ بہرحال اس فضا میں وہ جماعت اور پھر اسلامی جمعیت طلبہ تک پہنچے، کراچی کے ناظم بنے، منصوبہ بندی کے تحت اجتماعات، تربیتی پروگراموں، مطالعے اور تقریر کی مشق کی، اور یہیں ان کا تعارف خورشید احمد، ظفراسحٰق انصاری، محمد عمر چھاپرا، منظور احمد اور بہت سے دوسرے طلبہ سے ہوا، جنھوں نے اپنے شعبوں میں اختصاص پیدا کیا، جمعیت میں شامل ہوئے، ان میں سے بعض تحریک میں شامل ہو کر آگے بڑھتے چلے گئے اور بعض جماعت اسلامی کے قائدین کی جگہیں سنبھالتے گئے، کچھ خاک کا رزق ہوئے اور کچھ دنیا کا۔

یوں، اپنے کالج کی ابتدائی زندگی ہی میں برعظیم میں اسلام کی سربلندی کے لیے اٹھنے والی لہر کے ساتھ انھوں نے اپنے آپ کو وابستہ اور ہم آہنگ کر لیا تھا۔ ان کی یہ شعوری وابستگی ان کی زندگی کے آخری لمحوں تک بغیر کسی وقفے اور تذبذب کے جاری رہی۔ انھیں اعتراف ہے کہ وہ اچھے مقرر نہیں تھے، لیکن جب انھوں نے محسوس کیا کہ جس مشن کے ساتھ انھوں نے خود کو وابستہ کر لیا ہے، اس کا تقاضا ہے کہ وہ اپنی تقریری صلاحیتوں کو پروان چڑھائیں تو انھوں نے اس کے لیے محنت کے ساتھ کوشش کی اور کامیاب رہے (ص ۱۶۱-۱۶۴)۔ وہ کبھی عوامی مقرر تو نہ بن سکے، اور نہ شاید یہ ان کا مقصد تھا، لیکن سنجیدہ موضوعات پر سیرحاصل علمی گفتگو کا انھوں نے وہ ملکہ پیدا کر لیا، جو اُن کے قائد اور نمونہ کردار (سید مودودیؒ) کا ایک منفرد انداز اور اعزاز تھا۔

انھوں نے اپنی تحریری صلاحیتوں کو بڑھانے کی نہایت شعوری طور پر کوشش کی۔ وہ اعتراف کرتے ہیں کہ شروع میں اپنی تحریر و تقریر میں انھوں نے مصری مسلم اصحاب قلم کی تحریروں سے خوب استفادہ کیا (ص ۱۸۲، ۱۸۷، ۱۸۸)۔ جن کا انداز عموماً علمی اور منطقی ہوتا تھا لیکن یہ بھی حقیقت ہے کہ بعد میں خرم نے جو کتابیں، مضامین لکھے، ان میں ان کا ایک منفرد اسلوب جھلکتا ہے جس میں ایک جذباتی اپیل بھی ہے، اور

قوت کے ساتھ دعوت عمل بھی۔ اگرچہ پیش نظر کتاب میں بھی ان کی عملیت کے لیے اپیل نہایت واضح ہے' تاہم اس میں بھی ان کی ابتدائی تحریروں کی طرح' ان کے "مثالی" مصنفین کی سادگی اور غیر جذباتی اسلوب نگارش کا رنگ نمایاں ہے۔

ان کی سرگرمی کے اس ابتدائی دور میں' جمعیت کو اپنے کاموں کو پھیلانے کے سلسلے میں پہلی دفعہ مالی امداد کے لیے اپنے حلقے سے باہر دیکھنے کی ضرورت پڑی۔ انعام اللہ خاں (موتمر عالم اسلامی کے سیکرٹری) نے میمن تاجروں سے متعارف کرایا اور جمعیت کا "وسیع المشربی اور وسیع الظرفی" کا مزاج بننا شروع ہوا۔ "اس تجربے نے ہمیں ہمت اور حوصلہ دیا کہ باہر جا کر خیر اور بھلائی کے کاموں کے لیے مال دار لوگوں کی مدد اور ان کا تعارف حاصل کریں" (ص ۹۸)۔ اس سلسلے میں ان کے ماموں زاہد حسین نے بھی اپنا اثرورسوخ استعمال کیا۔ "اسٹوڈنٹس سروس یونٹ" جیسی تنظیم بنائی گئی' اور وہ اس کے سرپرست بنے۔ اس وقت کے معروف تاجر خانوادوں نے اس میں دل چسپی لی' اور اس طرح جمعیت (اور پھر تحریک اسلامی) کے لیے اہل ثروت کی سرپرستی اور تعاون کے دروازے کھلتے چلے گئے۔

خرم ۱۹۷۰ء اور بعد کے انتخابی معرکوں کے سلسلے میں یہ شکوہ کرتے نظر آتے ہیں کہ غریبوں کے مسائل' زمین داروں کے خاتمے/تحدید اور معاشرتی اور معاشی انصاف کو انتخابی منشور میں بھرپور طریقے سے پیش نہیں کیا گیا۔ اس باب میں ست روی کی جڑیں ۵۰ کے عشرے کے ابتدائی برسوں میں تلاش کی جا سکتی ہیں۔ اس کا نقصان جماعت کو بعد میں اٹھانا پڑا کہ "سوشلزم کے حوالے سے جماعت نے بہت سخت موقف اختیار کیا تھا" (ص ۴۶۳)۔ خرم اعتراف کرتے ہیں کہ ہماری سوچ' فکر اور مزاج' "متوقع نتائج اور درست تخمینے" تک پہنچنے میں رکاوٹ بنے اور یہ کہ "معاشی عدل کے مختلف پہلوؤں پر سوچ بچار یا اس کے اظہار' ترجیحات اور ابلاغ میں ہم واقعی بہت پیچھے تھے۔ منشور پر گفتگو کے دوران میں نے یہ تجویز پیش کی کہ' ہم یہ بات کہیں کہ کارخانوں کو چلانے کے لیے' بورڈ آف ڈائرکٹرز میں مزدوروں کے منتخب نمایندے بھی لیے جائیں گے' مگر یہ تجویز منظور نہیں کی گئی تھی۔ اس پر خود مولانا مرحوم نے یہ موقف اختیار کیا کہ جلاؤ' گھیراؤ کرنے اور ٹریڈ یونین پر پیشہ ور قابض لوگوں کو حصہ دار بنانے پر کون تیار ہو گا؟" (ص ۴۴۵)۔ ظاہر ہے کہ دست نگر اور ممنون احسان سے آزاد پالیسی سازی کی توقع نہیں کی جا سکتی۔ خرم یہ بات کھل کر تو نہیں کہتے' لیکن بین السطور وہ اعتراف کرتے ہیں کہ بوجوہ وہ عوامی مسائل اور معاشی طور پر پس ماندہ طبقوں کے سامنے ان کے دکھوں کا درماں پیش نہیں کر سکے۔ لیکن اس اعتراف میں بھی وہ تحفظات کے ساتھ بات کرتے ہیں۔

خرم اپنے مافی الضمیر کو ادا کرنے میں صلاحیت تامہ رکھتے ہیں' ان کے کسی بھی قاری نے شاید ہی یہ

شکایت کی ہو کہ ان کی بات سمجھنے میں دشواری ہوتی ہے' لیکن اس کتاب میں بعض جگہ ایسا محسوس ہوتا ہے۔ ممکن ہے اس وجہ سے ہو کہ یہ گفتہ [ٹیپ کیا ہوا بیانیہ] ہے' انھیں شاید نظرثانی کا موقع نہ ملا۔ یا شاید یہ کہ وہ کسی ذہنی کش مکش کا شکار رہے کہ وہ جو بات کہنا چاہتے ہیں' وہ ان کے اور ان کے ساتھیوں کے موقف سے کسی حد تک متغائر ہے' مثلاً ۱۹۷۰ء کی انتخابی مہم کے بارے میں وہ کہتے ہیں: ہمارے مقابلے میں بھٹو صاحب کا زور صرف تین الفاظ پر تھا: روٹی' کپڑا اور مکان۔ ان تین الفاظ میں سب کچھ تھا--- اب یہ کہنا کہ "یہ تو سب جھوٹ تھا" مجھے اس بات سے بھی اتفاق نہیں۔ لوگوں کی معاشی زندگی کو بہتر بنانے کے لیے جدوجہد کرنا بالکل درست بات ہے جس کے ہم خود بھی علم بردار ہیں۔ یہ سوچنا کہ بھٹو صاحب نے لازمی طور پر سب کو روٹی' کپڑا اور مکان دینے کا وعدہ کیا تھا' یا سب لوگوں نے صرف اور صرف اسی بنا پر ووٹ دیا تھا کہ یہ چیزیں ان کی ملکیت ہو جائیں گی' ایک خلاف واقعہ بات ہے۔ انھوں نے ان چیزوں کی فراہمی کا وعدہ کیا تھا' لازمی طور پر ہر ایک کو بہم پہنچا دینے کا لازمی وعدہ نہیں کیا تھا" (ص ۴۶۳)۔

خرم مراد کی دوسری تحریروں اور تقریروں کی طرح اس کتاب میں بھی ان کا مخصوص دعوتی طرز غالب ہے۔ ساڑھے پانچ سو صفحے کی اس کتاب میں ان کی ذاتی زندگی کے بارے میں معلومات بہت کم ہیں۔ طالب علمی کے زمانے سے ۱۹۷۲ء میں ڈھاکہ چھاؤنی سے بھارت میں جنگی کیمپ منتقلی تک کے اس سفر حیات میں ان کی ذاتی زندگی کے وہی گوشے سامنے آتے ہیں' جن کا تعلق ان کی تحریکی زندگی سے ہے' اور جن سے نہ صرف کارکنوں بلکہ عام قاری کو بھی ایک بہتر فکروکردار کی طرف رہنمائی ملتی ہے۔ ۱۹۶۹ء میں مجیب/بھاشانی کے حامی غنڈوں نے اسلامی جمعیت طلبہ کے ناظم محمد عبدالمالک کو شہید کیا تھا' تو جمعیت کی طرف سے جو ایف آئی آر درج کرائی گئی اس میں عوامی لیگ کے ایک اہم عہدے دار کے بیٹے کا نام بھی درج کرا دیا گیا۔ وہ غالباً بے گناہ تھا۔ خرم نے اس کی جان بچائی' اسے اپنے گھر میں پناہ دی اور فوجی کارروائی سے بچانے کے لیے اسے مغربی پاکستان بھجوانے میں مدد کی۔

نصف سے زیادہ کتاب "مشرقی پاکستان" کے تجربات پر مشتمل ہے۔ وہاں جماعت اسلامی' اسلامی جمعیت طلبہ اور جمعیت طلبہ عربیہ (جس کو تحریکی انداز دینے والے وہ خود تھے) مسلم لیگ' عوامی لیگ' نظام اسلام پارٹی' بھاشانی کی تحریک' ایوب خان کے خلاف تحریک' یحییٰ خان کا مارشل لا' ۱۹۷۰ء کے انتخابات اور اس کے نتیجے میں عوامی لیگ کے عروج' جمہوری عمل کی ناکامی اور فوجی مداخلت' عوامی اور فوجی تشدد' ان سب باتوں میں وہ نہ صرف مشرقی تھیٹر میں ایک مستغرق تماش بین تھے بلکہ متعدد مناظر میں خود بھی ایک کردار تھے۔ یہاں پہلی بار یہ محسوس ہوتا ہے کہ ان کی فکر' جو تحریک کی رَووں (currents) سے ہٹ کر ہوتی تھی' نسبتاً واضح انداز میں سامنے آتی ہے۔

۱۹۷۰ء کے عام انتخابات کے موقع پر نہ صرف یہ کہ انھیں کراچی میں "شوکت اسلام" کے جلوس کی بنیاد پر کراچی یا مغربی پاکستان میں کسی خاص کامیابی کی توقع نہ تھی' بلکہ مشرقی پاکستان میں بھی اُن کا خیال تھا کہ جماعت کوئی کامیابی حاصل نہ کر سکے گی۔ وہ کہتے ہیں: "ہمارا ڈھانچہ اور مزاج بلاشبہ ایک فضا کو تیار کر سکتا ہے لیکن اس کو cash نہیں کرا سکتا۔ واقعی یہ بہت بڑا لمحہ فکریہ ہے" (ص ۴۷۴)۔ انھیں مغربی پاکستان میں بھی تین' چار نشستوں سے زیادہ کی توقع نہیں تھی' اور اس وقت یہی ہوا۔ ان کے خیال میں' "جماعت کی تاریخ کا یہ سب سے زیادہ اعصاب شکن واقعہ تھا۔ اس واقعے نے مولانا مودودی پر' جماعت پر' جماعت کے کارکنوں پر' اور جماعت کی مستقبل کی قیادت پر بڑے گہرے اثرات ڈالے۔ لیکن میرا ذہن اس لحاظ سے پُرسکون تھا کہ میرے لیے یہ ایک بالکل متوقع حادثہ تھا.... میں اطمینان سے گھر گیا اور جا کر لیٹ گیا--- جب کہ دوسرے لوگ ریڈیو' ٹیلی ویژن سنتے اور دیکھتے رہے" (ص ۴۷۸)۔

مشرقی پاکستان کے بارے میں بھی وہ یہ سوچتے تھے کہ وہاں ایک زبردست لہر ہے: "مگر ہم اس لہر کے خلاف کھڑے ہیں اور ایسا پروگرام پیش کر رہے ہیں جس کے بارے میں ہمارا یہ دعویٰ ہے کہ اس سے بنگالیوں کے حقوق کا حصول ممکن ہے۔ اہل مشرقی پاکستان کے ساتھ سیاسی' سماجی اور معاشی سطح پر ہونے والی ساری ناانصافیوں کا بھی اس میں ازالہ موجود ہے۔ مگر اس کے باوجود یہ اس سے بہت کم موثر پروگرام ہے' جتنا کہ عوامی لیگ پیش کر رہی ہے.... کیا سیاسی اور معاشی استحصال کے خلاف بھرپور آواز اٹھانا صرف سیکولر جماعتوں کا حق ہے؟" (ص ۴۸۰)۔

وہ کہتے ہیں: "مشرقی پاکستان میں سوائے میرے تقریباً ہر شخص انتخابی معرکے کے بارے میں خوش فہم تھا" (ص ۴۸۱)۔ ان کے خیال میں ۸۵ء اور ۹۳ء کے انتخابات میں بھی یہی صورت حال رہی۔ جماعت اسلامی کے غیر مفاہمتی رویے اور دوسری طرف "الزامات' جھوٹے مفادات اور جھوٹے جذباتی نعرے لوگوں کو بہا کر لے گئے۔ بعد میں بھی ہر الیکشن میں اسی چیز کا سامنا کرنا پڑ رہا ہے" (ص ۴۸۲)۔

پچھلے انتخابات' منشور اور تخمینوں کے بارے میں خرم کا تجزیہ بڑی حد تک صحیح ہے مگر وہ ایک راست باز' کھرے اور صادق انسان کی حیثیت سے شاید یہی سمجھتے ہیں کہ انتخابات ہمیشہ غیر جانب دار ہوتے ہیں' اور ان میں منشورات کی شیطانی حکمت عملی سے لے کر بیلٹ بکسوں کو بھرنے کے منہاج تک کہیں غلط کاری نہیں ہوتی۔ یہ بات بہرحال درست نہیں۔ کیا دیانت دار' راست باز اور صالح افراد اور جماعتوں کو دروغ گوئی' تزویر' دھاندلی اور راست تشدد پر آمادہ کیا جا سکتا ہے' یا وہ ان انتخابی حکمت عملیوں میں شریک ہو سکتی ہیں' جو تیسری دنیا کا ناقابل تردید خاصہ ہیں؟ (پہلی اور دوسری دنیاؤں میں بھی فرق صرف حکمت عملی اور sophistication کا ہے' مگر یہ ایک دوسری بحث ہے)۔ بہرحال اس پوری داستان میں خرم'

جمہوریت اور جمہوری عمل پر غیر متزلزل ایمان رکھنے والے نظر آتے ہیں (۱۹۷۰ء کی ہولناک انتخابی شکست کے بعد مولانا مودودیؒ نے فرمایا تھا' اگر اسی طرح جمہوری عمل جاری رہا' تو تین' چار انتخابات کے بعد ہم اقتدار حاصل کر لیں گے!)۔

بھٹو - مجیب مذاکرات کی ناکامی کے بعد ۲۵ مارچ ۱۹۷۱ء سے مشرقی پاکستان میں فوجی کارروائیوں کے براہ راست مشاہدے کے نتیجے میں خرم' فوج کے طرز حکومت سے ہمیشہ کے لیے مایوس ہو گئے۔

اس دوران مکتی باہنی اور علیحدگی پسند بنگالیوں سے نمٹنے میں جمعیت کے مقامی نوجوانوں کو شریک کرنے کے لیے "البدر" کا قیام عمل میں آیا۔ خرم کہتے ہیں کہ جمعیت سے گہرے تعلق کے باوجود اس سلسلے میں انھیں مشورے میں شریک نہ کیا گیا۔ انھیں فوج کے ساتھ ان نوجوانوں کے تعاون' حدود کار اور پالیسی سے اختلاف تھا: "مگر میں نے اپنی سخت رائے کے باوجود اجتماعی فیصلے کا احترام کیا" (ص ۵۱۳)۔

بالکل فطری طور پر قاری کو یہ تجسس ہو گا کہ ۱۹۷۷ء کے جنرل ضیا الحق کے مارشل لا اور فوجی حکام کی "نفاذ اسلام" کی کوششوں کے بارے میں خرم مراد کے کیا تاثرات اور اندازے تھے' مگر' جیسا کہ اوپر بیان ہو چکا ہے' ان کی یہ داستان' ڈھاکہ چھاؤنی میں بھارتی فوج کی تحویل میں جانے اور پھر بھارت کے جنگی کیمپ میں منتقلی پر ختم ہو جاتی ہے' اور یہ سوال کہ کیا ان کے نزدیک ایک "سلطان نصیر" کے تعاون سے' جس کی پشت پر مسلح افواج ہوں' کوئی مثبت تبدیلی لائی جا سکتی ہے' تشنہ رہ جاتا ہے۔

تاہم اسے وہ بالکل تشنہ بھی نہیں چھوڑتے۔ اسی "عہد ستم" میں وہ میجر جنرل راؤ فرمان علی سے اپنی ملاقات کا ذکر کرتے ہیں' جو ان کے خیال میں ایک "دین پسند" اور "جماعت کے ساتھ ہمدردی کے جذبات" رکھنے والے آدمی تھے۔ انھوں نے خرم سے سوال کیا "اگر آپ کو اقتدار مل جائے تو آپ اپنا پروگرام کس طرح نافذ کریں گے؟"

بقول خرم' پھر وہ خود ہی کہنے لگے: "مارشل لا میں ہمارا تجربہ یہ ہے کہ ہمارے کوئی بھی منصوبے یا پروگرام ہوں' اور فیصلے یا عزائم ہوں' یہ تمام کے تمام frustrate ہو کر بالکل ناکام ہو جاتے ہیں۔ اگرچہ ہمارے پاس مسلح افواج کی ایک بہترین تنظیم اور اتھارٹی رکھنے والی طاقت بھی موجود ہے' لیکن خود ہماری سول بیورو کریسی ان کو عملی جامہ نہیں پہناتی' بلکہ ردعمل سے پہلے ان کی روح نکال کر رکھ دیتی ہے۔ اس لیے میں سمجھتا ہوں کہ جب تک آپ تحصیل دار کی سطح تک کیمونسٹوں کی طرح اپنے کسی تربیت یافتہ' بااعتماد' بے لوث اور سمجھ دار افسر کو مقرر نہیں کریں گے' اس وقت تک آپ اپنے پروگرام کا چھوٹے سے چھوٹا حصہ بھی نافذ نہیں کر سکیں گے۔ اسلامی انقلاب کا نفاذ تو ایک بہت بڑا کام ہے' اس کے لیے بہت زیادہ تربیت یافتہ' ہوشیار' دیانت دار' خدا خوف [کذا] اور یک سو ٹیم تیار کرنی پڑے گی" (ص ۵۱۶)۔

خرم کے خیال میں اس بات میں وزن ہے: "رائے عامہ کی ہم نوائی اور کثیر تعداد کے دلوں میں آمادگی کے باوجود ہم اس نوعیت کے سپاہی، کارکن اور سرکاری کارندوں کی موجودگی کے بغیر وہ انقلاب نہیں لا سکتے، کہ جسے رات کے اندھیرے میں سونے کا تاج مل جائے تو وہ اپنا نام ظاہر کیے بغیر سپہ سالار کے خیمے میں پہنچا دے کہ یہ امت مسلمہ کی امانت ہے"۔

"نفاذ اسلام کا کام صرف قانون کے ڈنڈے، حکومت کی گرفت، پارلیمنٹ میں اکثریت اور سیاسی اقتدار کے بل بوتے پر نہیں ہو سکتا۔ حکومت و سیاست اور اختیارات کے سرچشموں پر فائز لوگوں کی فکری تربیت بنیادی اہمیت رکھتی ہے" (ص ۵۱۶-۵۱۷)۔

پھر کیا یہ کلی وابستگی (total commitment) عقلی اور فکری بنیادوں پر استوار ہو سکتی ہے، جیسا کہ جماعت اسلامی کا عقل و فکر کو اپیل کرنے والا وافر لٹریچر فراہم کرتا ہے، یا جذبات کی بنیاد پر؟ جیسا کہ ہم دیکھ چکے ہیں، خرم کی رائے جذباتی پختگی ہی کو پروان چڑھانے اور راسخ کرنے کے حق میں محسوس ہوتی ہے۔

خرم کی بیش تر تحریروں کی طرح لمحات بھی ایک عملی کتاب ہے۔ ایک manual، کتاب ہدایت، نہایت واضح طور پر ایک بامقصد تحریر۔ لمحات کی صورت میں اپنی تحریکی زندگی کی جھلکیاں پیش کر کے وہ بغیر کسی اعتراف تقصیر و اعتذار کے بالواسطہ طور پر یہ بتاتے ہیں کہ ایک سچے دین دار طالب علم کی زندگی کیسی ہونی چاہیے۔ اسے اپنے تدریسی مشاغل، علمی شغف اور تحریکی مصروفیات کے درمیان کس طرح توازن قائم کرنا چاہیے، اپنی خفتہ صلاحیتوں کی دریافت اور فروغ کے لیے کس طرح کاوش کرنی چاہیے، تحریکی کارکنوں اور عام طلبہ کے ساتھ اس کی روش کیسی ہو، اساتذہ کے ساتھ تعلقات کس طرح استوار کیے جائیں، عملی اور پیشہ ورانہ زندگی کے تقاضوں کے ساتھ تحریک کے مطالبات کو کس طرح ہم آہنگ کیا جاسکتا ہے۔ اپنے اہداف کے حصول کے لیے نت نئے تجربات اور نئی راہیں کیسے نکالی جائیں، نقطہ ہاے نظر کے اختلاف اور حکمت عملی میں عدم اتفاق سے کیوں کر نمٹا جائے (ص ۱۰۴-۱۰۵)۔ انفرادی رائے اور نظم کی پابندی کے درمیان توافق کس طرح ہو (ص ۱۷۸، ۳۴۶، ۴۱۰، ۵۱۲)۔ خوش گمانیوں اور "برخود صحیح" اور "صواب بینی" کے فریب کس طرح عزم اور حوصلے کی شکست کا باعث بنتے ہیں، اور ان کے تباہ کن نتائج کس طرح آرزوؤں کو پژمردہ کر دیتے ہیں (ص ۴۷۵-۴۸۰)۔ ناگزیر طور پر انھوں نے متعدد مقامات پر، کہیں واضح اور کہیں کنایتاً، یہ بتایا ہے کہ ان کے اندازے، تخمینے اور ان پر مبنی حکمت عملی، جماعت کے بعض اکابر یا مجالس سے مختلف رہی تھیں، لیکن انھوں نے نظم جماعت کو مقدم جانا (ص ۴۸۱، ۴۸۲، ۵۲۲)۔

بہرحال جماعت اسلامی کی نصف صدی سے زیادہ کی تاریخ (جس کے بڑے حصے پر خرم کی یہ خود گفت سوانح بھی پھیلی ہوئی ہے، اور جس کے خاصے بڑے حصے میں وہ ایک فعال کردار کے طور پر سامنے آتے

ہیں) تعقل اور جذباتیت' آئینی ذرائع اور جارحانہ پیش قدمی (مسلح جارحیت؟)' جمہوریت پر ایمان اور فوجی آمریت سے توقعات کے متغائر' پیچ دار اور دشوار گزار راستوں میں سرگرم سفر نظر آتی ہے۔ اس نہایت دل چسپ اور قابل مطالعہ کتاب میں جسے اپنے "اعتراف" میں پروفیسر خورشید احمد نے "اردو کے تحریکی ادب میں ایک منفرد اضافہ" قرار دیا ہے' خرم کی مسحور کن شخصیت کا عکس بڑی حد تک موجود ہے۔

لمحات چوں کہ ایک مقصدی کتاب ہے' اس لیے اس کا اسلوب بھی خرم کی دوسری تحریروں کی طرح سادہ لیکن دل آویز ہے۔ تاہم تحریر کی یہ سادگی' اور موضوعات کی متانت' اسے کہیں بھی اکتا دینے والی کتاب نہیں بنا دیتی۔ کیونکہ انداز واعظانہ نہیں' بلکہ داستان گو جیسا ہے۔ پوری کتاب میں واقعات کا ہجوم اور افکار و خیالات کی یلغار اس قدر زبردست ہے کہ پڑھنے والے کی توجہ اور دل چسپی کہیں کم نہیں ہوتی' اور وہ کہیں بھی اکتاہٹ کا شکار نہیں ہوتا۔ واقعات کی تفصیلات اور ان میں موثر افراد اور کرداروں اور ان کی جزئیات پر خرم کے حافظے کی گرفت بڑی مضبوط اور قابل داد ہے۔ یوں محسوس ہوتا ہے کہ یہ کتاب ایک تفصیلی روزنامچے کو دیکھ کر مرتب کی گئی ہے' لیکن ایسا نہیں ہے بلکہ جیسا کہ بیان کیا جا چکا ہے' یہ فی البدیہہ' بے ساختہ اور ٹیپ شدہ گفتگو سے مرتب شدہ تحریر ہے۔

ایک ناول کی طرح دل چسپ' لغویات اور لایعنی مطائبات اور قصوں سے پاک یہ صاف ستھری کتاب ایک شخصیت کا خاکہ ہی نہیں' بلکہ پاکستان کے ایک عہد کی داستان بھی ہے۔ وہ داستان جس سے نوجوان نسل یا تو آگاہ ہی نہیں' یا اُسے بھولتی جا رہی ہے۔ میرا خیال ہے کہ ہر طالب علم اور تحریک اسلامی ہی نہیں بلکہ کسی بھی تحریک کا کارکن اس جیتی جاگتی تحریر سے وہ کچھ حاصل کر سکتا ہے' جو ایک خشک علمی تحریر سے ممکن نہیں۔

**لمحات' خرم مراد' منشورات' منصورہ' لاہور۔ صفحات: ۵۶۰۔ مجلد: ۱۹۰ روپے' پیپر بیک: ۱۴۰ روپے۔**

---

**کراچی میں ماہنامہ ترجمان القرآن حاصل کیجیے**

**دی بک ڈسٹری بیوٹرز**

152-B' خداداد کالونی' کراچی - فون: 7787137